دیتا ہے، اور انسان کو بتلاتا ہے کہ آفاق عالم اور خود ان کے نفوس میں اللہ تعالیٰ نے جو اپنی عظیم نشانیاں رکھی ہیں، ان میں غور و فکر کرو تاکہ تم ان سب چیزوں کے خالق اور مالک کو پہچانو۔

دوسری آیت میں فرمایا قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ، یعنی لوگوں کو چاہیے کہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت ہی کو اصلی خوشی کی چیز سمجھیں اور صرف اسی چیز پر خوش ہوں، دنیا کے چند روزہ مال و متاع اور راحت و عزت درحقیقت خوش ہونے کی چیز ہی نہیں، کیونکہ اول تو وہ کتنی ہی زیادہ کسی کو حاصل ہو، ادھوری ہی ہوتی ہے مکمل نہیں ہوتی، دوسرے ہر وقت اس کے زوال کا خطرہ لاحق ہے۔ اس لئے آخر آیت میں فرمایا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ، یعنی اللہ کا فضل و رحمت ان تمام مال و دولت اور عزت و سلطنت سے بہتر ہے جن کو انسان اپنی زندگی بھر کا سرمایہ سمجھ کر جمع کرتا ہے۔

اس آیت میں دو چیزوں کو فرحت و مسرت کا سامان قرار دیا ہے ایک فضل دوسرے رحمت، ان دونوں سے مراد یہاں کیا ہے؟ اس بارے میں ایک حدیث حضرت انسؓ کی روایت سے یہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے فضل سے مراد قرآن ہے اور رحمت سے مراد یہ ہے کہ تم کو قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق بخشی (روح المعانی از ابن مردویہ)

یہی مضمون حضرت براء بن عازبؓ اور ابو سعید خدریؓ سے بھی منقول ہے اور بہت سے حضرات مفسرین نے فرمایا کہ فضل سے مراد قرآن اور رحمت سے مراد اسلام ہے، اور مطلب اس کا بھی وہی ہے جو حدیث سابق سے معلوم ہوا کہ رحمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن سکھایا اور اس پر عمل کرنے کی توفیق بخشی، کیونکہ اسلام اسی حقیقت کا ایک عنوان ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ فضل سے مراد قرآن اور رحمت سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، قرآن کریم کی آیت وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہے، اور حاصل اس کا بھی پہلی تفسیر سے کچھ مختلف نہیں، کیونکہ عمل بالقرآن یا اسلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پیروی کے مختلف عنوانات ہیں۔

اس آیت میں مشہور قراءت کے مطابق فَلْيَفْرَحُوْا بصیغہ غائب آیا ہے، حالانکہ اس کے اصل مخاطب اُس وقت کے موجودین، حاضرین تھے جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس جگہ صیغہ خطاب کا استعمال کیا جاتا، جیسا کہ بعض قراءتوں میں آیا بھی ہے، مگر مشہور قراءت میں صیغہ

غائب استعمال کرنے کی حکمت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا اسلام کی رحمتِ عامہ صرف اس وقت کے حاضرین و موجودین کے لئے مخصوص نہیں تھی بلکہ قیامت تک پیدا ہونے والی نسلوں کو بھی شامل ہے۔ (روح المعانی)

فائدہ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرح و خوشی کا اس دنیا میں کوئی مقام ہی نہیں، ارشاد ہے لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ، یعنی خوشی میں مست نہ ہو، اللہ ایسے خوش ہونیوالوں کو پسند نہیں فرماتے۔ اور آیت مذکورہ میں بصیغۂ امر خوش ہونے کا حکم دیا گیا ہے، اس ظاہری تعارض کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جہاں خوش ہونے کو منع فرمایا ہے وہاں خوشی کا تعلق متاع دنیا سے ہے، اور جہاں خوش ہونے کا حکم دیا ہے وہاں خوشی کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے، دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ ممانعت کی جگہ میں مطلق خوشی مراد نہیں بلکہ خوشی میں بدمست ہو جانا مراد ہے، اور اجازت کی جگہ میں مطلق خوشی مراد ہے۔

تیسری آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو حلال و حرام کے معاملہ میں اپنی ذاتی رائے کو دخل دیتے ہیں، اور قرآن و سنت کی سند کے بغیر جس چیز کو چاہا حلال قرار دیدیا جس کو چاہا حرام کہہ دیا، اس پر قیامت کی شدید وعید ذکر کی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز یا کسی فعل کے حلال یا حرام ہونے کا اصل مدار انسانی رائے پر نہیں بلکہ وہ خاص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حق ہے ان کے احکام کے بغیر کسی چیز کو نہ حلال کہنا جائز ہے نہ حرام۔

چوتھی آیت میں اللہ جل شانہ کے علم محیط اور اس کی بے مثال وسعت کا ذکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کیا گیا ہے کہ آپ جس کام اور جس حال میں ہمیشہ ہوتے ہیں یا قرآن پڑھتے ہیں اس کا کوئی جزء ہم سے مخفی نہیں اسی طرح تمام انسان جو کچھ عمل کرتے ہیں وہ ہماری نظروں کے سامنے ہیں اور آسمان و زمین میں کوئی ایک ذرہ بھی ہم سے چھپا ہوا نہیں ہے بلکہ ہر چیز کتاب مبین یعنی لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے۔

بظاہر اس جگہ علم الٰہی کی وسعت اور ہر چیز کو محیط ہونے کے بیان میں حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جائے کہ اگرچہ مخالف اور دشمن آپ کے بہت ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت آپ کے ساتھ ہے آپکو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

یاد رکھو جو لوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ

جو لوگ کہ ایمان لائے اور ڈرتے رہے ، ان کے لئے ہے خوش خبری دنیا کی

الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ

زندگانی میں اور آخرت میں ، بدلتی نہیں اللہ کی باتیں ، یہی ہے

الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۴﴾

بڑی کامیابی ۔

خلاصۂ تفسیر

یہ تو علم الٰہی کا بیان ہوا آگے مخلصین و مطیعین کی محفوظیت کا بیان ہے کہ، یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ دناک واقعہ پڑنے والا ہے اور نہ وہ (کسی مطلب کے فوت ہونے پر) مغموم ہوتے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ ان کو خوف ناک اور غم ناک حوادث سے بچاتا ہے اور) وہ (اللہ کے دوست) وہ ہیں جو ایمان لائے اور (معاصی سے) پرہیز رکھتے ہیں (یعنی ایمان اور تقویٰ سے اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے اور خوف و حزن سے ان کے محفوظ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ) ان کے لئے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی (من جانب اللہ خوف و حزن سے بچنے کی) خوش خبری ہے (اور) اللہ کی باتوں میں (یعنی وعدوں میں) کچھ فرق ہوا نہیں کرتا (پس جب بشارت میں ان سے وعدہ کیا گیا اور وعدہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے، اس لئے عدم خوف و عدم حزن لازم ہے اور) یہ (بشارت جو مذکور ہوئی) بڑی کامیابی ہے ۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں اولیاء اللہ کے مخصوص فضائل اور ان کی تعریف اور پہچان پھر دنیا و آخرت میں ان کے لئے بشارت کا ذکر ہے ، ارشاد فرمایا کہ اولیاء اللہ کو نہ کسی ناگوار چیز کے پیش آنے کا خطرہ ہوگا اور نہ کسی مقصد کے فوت ہوجانے کا غم ، اور اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کی، ان کے لئے دنیا میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی ۔

اس میں چند باتیں قابلِ غور ہیں : اوّل یہ کہ اولیاء اللہ پر خوف و غم نہ ہونے کے کیا معنی ہیں ؟

دوسرے یہ کہ اولیاء اللہ کی تعریف کیا ہے اور ان کی علامات کیا ہیں ؟ تیسرے یہ کہ

دنیا و آخرت میں ان کی بشارت سے کیا مراد ہے ؟

پہلی بات کہ اولیاء اللہ پر خوف و غم نہیں ہوتا ، اس سے یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ آخرت میں حساب کتاب کے بعد جب ان کو ان کے مقام جنت میں داخل کر دیا جائے گا تو خوف و غم سے ان کو ہمیشہ کے لئے نجات ہو جائے گی ، نہ کسی تکلیف و پریشانی کا خطرہ رہے گا نہ کسی محبوب و مطلوب چیز کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم ہوگا ، بلکہ جنت کی نعمتیں دائمی اور لازوال ہوں گی ، اس معنی کے اعتبار سے تو مضمون آیت پر کوئی اشکال نہیں لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس میں اولیاء اللہ کی کوئی خصوصیت نہ رہی بلکہ تمام اہل جنت جن کو جہنم سے نجات مل گئی وہ اسی حال میں ہوں گے ، ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ انجام کار جنت میں پہنچ گئے وہ سب اولیاء اللہ ہی کہلائیں گے ، دنیا میں ان کے اعمال کتنے ہی مختلف رہے ہوں مگر دخولِ جنت کے بعد سب کے سب اولیاء اللہ کی ہی فہرست میں شمار ہونگے ۔

لیکن بہت سے مفسرین نے فرمایا کہ اولیاء اللہ پر خوف و غم نہ ہونا دنیا و آخرت دونوں کے لئے عام ہے اور اولیاء اللہ کی خصوصیت یہی ہے کہ دنیا میں بھی وہ خوف و غم سے محفوظ ہیں اور آخرت میں ان پر خوف و غم نہ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں ، اور اس میں سب اہل جنت داخل ہیں ۔

مگر اس پر حالات و واقعات کے اعتبار سے یہ اشکال ہے کہ دنیا میں تو یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ اولیاء اللہ تو کیا انبیاء علیہم السلام بھی اس دنیا میں خوف و غم سے محفوظ نہیں بلکہ ان کا خوف و خشیت اوروں سے زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا یعنی اللہ تعالیٰ سے پوری طرح علماء ہی ڈرتے ہیں ، اور دوسری جگہ میں اولیاء اللہ ہی کا یہ حال بیان فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ یعنی یہ لوگ اللہ کے عذاب سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں جس سے کوئی بے فکر ہو کر بیٹھ سکے ۔

اور واقعات بھی یہی ہیں جیسا کہ شمائل ترمذی کی حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر حالات میں متفکر و مغموم نظر آتے تھے ، اور آپ نے خود فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہوں ۔

صحابہ کرامؓ میں سب سے افضل حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما اور تمام صحابہؓ و تابعین اور اولیاء اللہ کی گریہ وزاری اور خوف آخرت کے واقعات بیشمار ہیں ۔

اس لئے روح المعانی میں علامہ آلوسی نے یہ فرمایا کہ حضرات اولیاء اللہ کا دنیا میں خوف و غم

سے محفوظ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ جن چیزوں کے خوف وغم میں عام طور سے اہلِ دنیا مبتلا رہتے ہیں کہ دنیوی مقاصد آرام وراحت عزت ودولت میں ذرا سی کمی ہو جانے پر غم لگتے ہیں اور ذرا ذرا سی تکلیف وپریشانی کے خوف سے ان سے بچنے کی تدبیروں میں رات دن کھوتے رہتے ہیں، اولیاء اللہ کا مقام ان سب سے بالا وبلند ہوتا ہے، ان کی نظر میں نہ دنیا کی فانی عزت ودولت، راحت وآرام کوئی چیز ہے جس کے حاصل کرنے میں سرگرداں ہوں، اور نہ یہاں کی محنت وکلفت اور رنج کچھ قابلِ التفات ہے جس کی مدافعت میں پریشان ہوں بلکہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ؎

نہ شادی دادسامانے نہ غم آورد تقصانے — بہ پیش ہمت ما ہرچہ آمد بود مہمانے

اللہ جل شانہٗ کی عظمت ومحبت اور خوف وخشیت ان حضرات پر ایسی چھائی ہوتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی رنج وراحت، سود وزیاں پر کاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے، بقولِ بعض ؎

یہ ننگِ عاشقی ہیں سود وحاصل دیکھنے والے
یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے

دوسری بات اولیاء اللہ کی تعریف اور ان کی علامات سے متعلق ہے، اولیاء ولی کی جمع ہے، لفظِ ولی عربی زبان میں قریب کے معنی میں بھی آتا ہے اور دوست ومحب کے معنی میں بھی، اللہ تعالیٰ کے قرب ومحبت کا ایک عام درجہ تو ایسا ہے کہ اس سے دنیا کا کوئی انسان وحیوان بلکہ کوئی چیز بھی مستثنیٰ نہیں، اگر یہ قرب نہ ہو تو سارے عالم میں کوئی چیز وجود ہی میں نہیں آسکتی، تمام عالم کے وجود کی اصلی علت وہی خاص رابطہ ہے جو اس کو حق تعالیٰ شانہٗ سے حاصل ہے گو اس رابطہ کی حقیقت کو نہ کسی نے سمجھا اور نہ سمجھ سکتا ہے مگر ایک بے کیف رابطہ کا ہونا یقینی ہے، مگر لفظ اولیاء اللہ میں یہ درجہ ولایت کا مراد نہیں بلکہ ولایت ومحبت اور قرب کا ایک دوسرا درجہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے ساتھ خاص ہے یہ قرب محبت کہلاتا ہے جن لوگوں کو یہ قرب خاص حاصل ہو وہ اولیاء اللہ کہلاتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیثِ قدسی میں ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو پھر میں ہی اسکے کان بن جاتا ہوں وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعہ سنتا ہے، میں ہی اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، وہ جو کچھ دیکھتا ہے مجھ سے دیکھتا ہے میں ہی اس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں وہ جو کچھ کرتا ہے مجھ سے کرتا ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کی کوئی حرکت وسکون اور کوئی کام میری رضاء کے خلاف نہیں ہوتا۔

اور اس ولایتِ خاصہ کے درجات بیشمار اور غیر متناہی ہیں، اس کا اعلیٰ درجہ انبیاء علیہم السلام کا حصہ ہے، کیونکہ ہر نبی کا ولی اللہ ہونا لازمی ہے، اور اس میں سب سے اونچا مقام سید الانبیاء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اور ادنیٰ درجہ اس ولایت کا وہ ہے جس کو صوفیائے کرامؒ کی اصطلاح میں درجہ فناء کہا جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کا قلب اللہ تعالیٰ کی یاد میں ایسا مستغرق ہو کہ دنیا میں کسی کی محبت اس پر غالب نہ آئے، وہ جس سے محبت کرتا ہے تو اللہ کے لئے کرتا ہے، جس سے نفرت کرتا ہے تو اللہ کے لئے کرتا ہے، اس کے حب وبغض اور محبت وعداوت میں اپنی ذات کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ظاہر وباطن اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی میں مشغول رہتا ہے اور وہ ہر ایسی چیز سے پرہیز کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہو، اسی حالت کی علامت ہے کثرتِ ذکر اور دوام طاعت، یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا اور ہمیشہ ہر حال میں اس کے احکام کی اطاعت کرنا، یہ دو وصف جس شخص میں موجود ہوں وہ ولی اللہ کہلاتا ہے جس میں ان دونوں میں سے کوئی ایک نہ ہو وہ اس فہرست میں داخل نہیں، پھر جس میں یہ دونوں موجود ہوں اس کے درجات ادنیٰ واعلیٰ کی کوئی حد نہیں، انہیں درجات کے اعتبار سے اولیاء اللہ کے درجات متفاضل اور کم وبیش ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ مذکور ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اس آیت میں اولیاء اللہ سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو خالص اللہ کے لئے آپس میں محبت کرتے ہیں، کوئی دنیاوی غرض درمیان میں نہیں ہوتی، (مظہری از ابن مردویہ) اور ظاہر ہے کہ یہ حالت انہیں لوگوں کی ہو سکتی ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس درجہ ولایت کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ امت کے افراد کو یہ درجۂ ولایت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فیضِ صحبت سے حاصل ہو سکتا ہے، اسی سے تعلق مع اللہ کا وہ رنگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا اپنے حوصلہ کے مطابق اس کا کوئی حصہ امت کے اولیاء کو ملتا ہے، پھر یہ فیضِ صحبت صحابۂ کرام رضؓ کو بلا واسطہ حاصل تھا، اسی وجہ سے ان کا درجۂ ولایت تمام امت کے اولیاء واقطاب سے بالاتر تھا، بعد کے لوگوں کو یہی فیض ایک واسطہ یا چند واسطوں سے حاصل ہوتا ہے جتنے

وسائط بڑھتے جاتے ہیں اتنا ہی اس میں فرق پڑتا جاتا ہے، یہ واسطہ صرف وہی لوگ بن سکتے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے ہوتے آپ کی سنّت کے پیرو ہیں ایسے لوگوں کی کثرت سے مجالست اور صحبت جبکہ اس کے ساتھ ان کے ارشادات کی پیروی اور اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت بھی ہو، یہی نسخہ ہے درجۂ ولایت حاصل کرنے کا، جو تین جزء سے مرکب ہے، کسی ولی اللہ کی صحبت، اس کی اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت، بشرطیکہ یہ کثرتِ ذکر مسنون طریقہ پر ہو، کیونکہ کثرتِ ذکر سے آئینہ قلب کو جلا ہوتی ہے تو وہ نورِ ولایت کے انعکاس کے قابل بن جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ ہر چیز کے لئے صیقل اور صفائی کا کوئی طریقہ ہوتا ہے، قلب کی صیقل ذکر اللہ سے ہوتی ہے، اس کو بیہقی نے بروایت ابن عمرؓ نقل فرمایا ہے۔ (مظہری)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو کسی بزرگ سے محبت کرتا ہے مگر عمل کے اعتبار سے ان کے درجہ تک نہیں پہنچتا؟ آپ نے فرمایا اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ یعنی ہر شخص اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی محبت و صحبت انسان کے لئے حصول ولایت کا ذریعہ ہے، اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت رزینؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رزینؓ سے فرمایا کہ میں تمہیں دین کا ایسا اصول بتلاتا ہوں جس سے تم دنیا و آخرت کی فلاح و کامیابی حاصل کر سکتے ہو، وہ یہ ہے کہ اہلِ ذکر کی مجلس و صحبت کو لازم پکڑو اور جب تنہائی میں جاؤ تو جتنا زیادہ ہو سکے اللہ کے ذکر سے اپنی زبان کو حرکت دو، جس سے محبت کرو اللہ کے لئے کرو جس سے نفرت کرو اللہ کے لئے کرو۔ (مظہری)

مگر یہ صحبت و مجالست انہیں لوگوں کی مفید ہے جو خود ولی اللہ متبع سنت ہوں اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تابع نہیں وہ خود درجۂ ولایت سے محروم ہیں، چاہے کشف و کرامات ان سے کتنے ہی صادر ہوں۔ اور جو شخص مذکورہ صفات کے اعتبار سے ولی ہو گا [illegible] (مظہری)

اولیاء اللہ کی علامت اور پہچان تفسیر مظہری میں حدیث قدسی کے حوالہ سے یہ نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے اولیاء میرے بندوں میں سے وہ لوگ ہیں جو میری یاد کے ساتھ یاد آویں اور جن کی یاد کے ساتھ میں یاد آؤں، اور ابن ماجہ میں بروایت حضرت اسماء بنت یزید مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیاء اللہ کی یہ پہچان بتلائی

اَلَّذِیْنَ اِذَا رُءُوْا ذُکِرَ اللّٰہُ، یعنی جن کو دیکھ کر خدا یاد آئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر انسان کو اللہ کے ذکر کی توفیق اور دنیاوی فکروں کی کمی محسوس ہو، یہ علامت اس کے ولی اللہ ہونے کی ہے۔

تفسیر مظہری میں فرمایا کہ عوام نے جو اولیاء اللہ کی علامت کشف و کرامت یا غیب کی چیزیں معلوم ہونے کو سمجھ رکھا ہے یہ غلط اور دھوکہ ہے، ہزاروں اولیاء اللہ ہیں جن سے اس طرح کی کوئی چیز ثابت نہیں اور اس کے خلاف ایسے لوگوں سے کشف اور غیب کی خبریں منقول ہیں جن کا ایمان بھی درست نہیں۔

آخر آیت میں جو یہ فرمایا گیا کہ اولیاء کے لئے دنیا میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی، آخرت کی خوش خبری تو یہ ہے کہ موت کے وقت جب اس کی روح کو اللہ کے پاس لے جایا جائے گا اس وقت اس کو خوش خبری جنت کی ملے گی پھر قیامت کے روز قبر سے اٹھنے کے وقت جنت کی خوش خبری دی جائے گی جیسا کہ طبرانی نے بروایت ابن عمرؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کو نہ موت کے وقت کوئی وحشت ہوگی نہ قبر میں اور نہ قبر سے اٹھنے کے وقت، گویا میری آنکھیں اس وقت کا حال دیکھ رہی ہیں جب یہ لوگ اپنی قبروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اٹھیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہمارا غم دور کر دیا۔

اور دنیا کی بشارت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ سچی خوابیں، جو انسان خود دیکھے یا اس کے لئے کوئی دوسرا دیکھے جن میں ان کے لئے خوش خبری ہو۔ (رواہ البخاری عن ابی ھریرۃ رض)

اور دنیا کی دوسری بشارت یہ ہے کہ عام مسلمان بغیر کسی غرض کے اس سے محبت کریں اور اچھا سمجھیں، اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تِلْکَ عَاجِلُ بُشْرَی الْمُؤْمِنِ یعنی عام مسلمانوں کا اچھا سمجھنا اور تعریف کرنا مؤمن کے لئے نقد خوش خبری ہے۔ (مسلم و بغوی)

وَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ؕ هُوَ السَّمِیْعُ

اور رنج مت کر ان کی بات سے، اصل میں سب زور اللہ کے لئے ہے، وہی ہے سننے والا

الْعَلِیْمُ ﴿۶۵﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ ؕ وَمَا

جاننے والا، سنتا ہے اللہ کا ہے جو کوئی ہے آسمانوں میں اور جو کوئی ہے زمین میں

یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ یَّ

جو پیچھے پڑے ہیں اللہ کے سوا شریکوں کو پکارنے والے، سو یہ کچھ نہیں

مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ

ہمارے پاس سے کہنے لگے یہ تو جادو ہے کھلا ، کہا موسیٰ نے کیا تم یہ کہتے ہو

لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ۭ اَسِحْرٌ هٰذَا ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْٓا

حق بات کو جب وہ پہنچے تمہارے پاس ، کیا یہ جادو ہے ، اور نجات نہیں پاتے جادوگر لانے والے ، بولے

اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا

کیا تو آیا ہے کہ ہم کو پھیر دے اس رستہ سے جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو اور تم دونوں کو

الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ وَقَالَ

سرداری مل جائے اس ملک میں ، اور ہم نہیں ہیں تم کو ماننے والے اور بولا

فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ

فرعون لاؤ میرے پاس جو جادوگر ہو پڑھا ہوا ، پھر جب آئے جادوگر کہا ان کو

مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى

موسیٰ نے ڈالو جو تم ڈالتے ہو ، پھر جب انہوں نے ڈالا موسیٰ بولا

مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ

کہ جو تم لائے ہو سو جادو ہے ، اب اللہ اس کو بگاڑتا ہے ، بیشک اللہ نہیں سنوارتا شریروں

الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾

کے کام ، اور اللہ پختا کرتا ہے حق بات کو اپنے حکم سے اور پڑے برا مانیں گنہگار ۔

خلاصۂ تفسیر

پھر ان (مذکور) پیغمبروں کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس اپنے معجزات (عصا اور ید بیضاء) دے کر بھیجا سو انہوں نے (دعوے کے ساتھ ہی ان کی تصدیق کرنے سے) تکبر کیا (اور طلبِ حق کے لئے غور بھی تو نہ کیا) اور وہ لوگ جرائم کے خوگر تھے (اس لئے اطاعت نہ کی) پھر جب (بعد دعوی کے) ان کو ہمارے پاس سے (نبوتِ موسویہ پر) صحیح دلیل پہنچی (مراد اس سے معجزہ ہے) تو وہ لوگ کہنے لگے کہ یقیناً یہ صریح جادو ہے، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم اس صحیح دلیل کی نسبت جب کہ وہ تمہارے پاس پہنچی ایسی بات کہتے ہو (کہ یہ جادو ہے) کیا یہ جادو ہے، حالانکہ جادوگر (جب کہ دعوائے نبوت کا کریں تو اظہارِ معجزہ میں) کامیاب نہیں ہوا کرتے (اور میں کامیاب ہوا کہ اول (دعوی) کیا پھر معجزات ظاہر کر دیئے) وہ لوگ (اس تقریر کا کچھ جواب نہ دے سکے، ویسے ہی براہِ جہالت)

کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ اس طریقہ سے ہٹا دو جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے اور (اس لئے آئے ہو کہ) تم دونوں کو دنیا میں ریاست (اور سرداری) مل جاوے اور (تم خوب سمجھ لو کہ) ہم تو تم دونوں کو کبھی نہ مانیں گے، اور فرعون نے (اپنے سرداروں سے) کہا کہ میرے پاس تمام ماہر جادوگروں کو جو ہمارے قلمرو میں ہیں) حاضر کرو (چنانچہ جمع کئے گئے) سو جب وہ آئے (اور موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہوا تو) موسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کہ ڈالو جو کچھ تم کو (میدان میں) ڈالنا ہے، سو جب انہوں نے (اپنا جادو کا سامان) ڈالا تو موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ جو کچھ تم (بناکر) لائے ہو جادو ہے (نہ وہ جس کو فرعون والے جادو کہتے ہیں) یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس (جادو) کو ابھی درہم برہم کئے دیتا ہے (کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے فسادیوں کا کام بننے نہیں دیتا، جو معجزہ کے ساتھ مقابلہ سے پیش آویں) اور اللہ تعالیٰ (جس طرح اہلِ باطل کے باطل کو بمقابلہ معجزاتِ حقہ کے باطل کر دیتا ہے اسی طرح) دلیل صحیح (یعنی معجزہ) کو اپنے وعدوں کے موافق (کہ اثباتِ نبوت انبیاءؑ کے متعلق ہیں) ثابت کر دیتا ہے گو مجرم (اور کافر) لوگ کیسا ہی ناگوار سمجھیں۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰي خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ

پھر کوئی ایمان نہ لایا موسیٰ پر مگر کچھ لڑکے اس کی قوم کے ڈرتے ہوئے فرعون سے

وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ

اور ان کے سرداروں سے کہ کہیں ان کو پھلا دے، اور فرعون پڑھ رہا ہے ملک میں ، اور اس نے

لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰي يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ

ہاتھ چھوڑ رکھا ہے ، اور کہا موسیٰ نے اے میری قوم اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر

فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا عَلَي اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ

تو اسی پر بھروسہ کرو اگر ہو تم فرماں بردار ، تب وہ بولے ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ

اے رب ہمارے نہ آزما ہم پر زور اس ظالم قوم کا ، اور چھڑا دے ہم کو مہربانی (اپنی)

مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

ان کافر لوگوں سے ۔

خلاصۂ تفسیر

پس (جب عصا کا معجزہ ظاہر ہوا تو) موسیٰ (علیہ السلام) پر (شروع شروع میں) ان

کی قوم میں سے صرف قدرے قلیل آدمی ایمان لائے وہ بھی فرعون سے اور اپنے حکام سے ڈرتے ڈرتے کہ کہیں (ظاہر ہونے پر) ان کو تکلیف (نہ) پہنچاوے اور واقع میں (ڈرنا ان کا بے جا نہ تھا کیونکہ) فرعون اس ملک میں زور (سلطنت) رکھتا تھا اور یہ بھی بات تھی کہ وہ حد (انصاف) سے باہر ہوجاتا تھا (ظلم کرنے لگتا تھا پھر جو شخص حکومت کے ساتھ ظلم کرتا ہو اس سے تو ڈر لگتا ہی ہے) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (جب ان کو خائف دیکھا تو ان سے) فرمایا کہ اے میری قوم اگر تم (سچے) دل سے (اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو (سوچ بچار مت کرو بلکہ) اسی پر توکل کرو اگر تم (اس کی) اطاعت کرنے والے ہو، انہوں نے (جواب میں) عرض کیا کہ ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا (بعد اس کے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ) اے ہمارے پروردگار ہم کو ظالم لوگوں کا تختۂ مشق نہ بنا اور ہم کو اپنی رحمت کے صدقے ان کافروں سے نجات دے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا

اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو کہ مقرر کرو اپنی قوم کے واسطے مصر میں گھر

وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۷

اور بناؤ اپنے گھر قبلہ رُو اور قائم کرو نماز اور تو خوش خبری دے ایمان والوں کو

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا

اور کہا موسیٰ نے اے رب ہمارے تو نے دی ہے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو رونق اور مال

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى

دنیا کی زندگی میں اے رب اس واسطے کہ بہکائیں تیری راہ سے، اے رب مٹا دے

اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ

ان کے مال اور سخت کر دے ان کے دل کہ نہ ایمان لائیں جب تک دیکھ لیں عذاب

الْاَلِيْمَ ۝۸۸ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ

دردناک، فرمایا، قبول ہوچکی دعا تمہاری سو تم دونوں ثابت رہو اور مت چلو

سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۸۹ وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْبَحْرَ

راہ ان کی جو ناواقف ہیں، اور پار کر دیا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ

پھر پیچھا کیا ان کا فرعون نے اور اس کے لشکر نے شرارت سے اور زیادتی سے، یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا

قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ

بولا یقین کر لیا میں نے کہ کوئی معبود نہیں مگر جس پر ایمان لائے بنی اسرائیل

وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۹۰ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ

اور میں ہوں فرماں برداروں میں، اب یہ کہتا ہے اور تو نافرمانی کرتا رہا اس سے پہلے اور رہا

مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۹۱

گمراہوں میں۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (اس دعا کے قبول کرنے کا سامان کیا کہ) موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے بھائی (ہارون علیہ السلام) کے پاس وحی بھیجی کہ تم دونوں اپنے ان لوگوں کے لئے (بدستور) مصر میں گھر برقرار رکھو یعنی وہ ڈر کر گھر نہ چھوڑیں ہم ان کے محافظ ہیں) اور (نماز کے اوقات میں) تم سب اپنے انہی گھروں کو نماز پڑھنے کی جگہ قرار دے لو (مساجد کی حاضری خوف کی وجہ سے معاف ہے) اور (یہ ضروری ہے کہ) نماز کے پابند رہو (تاکہ نماز کی برکت سے اللہ تعالیٰ جلدی اس مصیبت سے چھڑا دے) اور (اے موسیٰ) آپ مسلمانوں کو بشارت دے دیں (کہ اب جلدی یہ مصیبت ختم ہوجاوے گی) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (دعا میں) عرض کیا کہ اے ہمارے رب (ہم کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ) آپ نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو سامانِ تجمل اور طرح طرح کے مال دنیوی زندگی میں اے ہمارے رب اسی واسطے دیئے ہیں کہ وہ آپ کی راہ سے (لوگوں کو) گمراہ کریں (پس جب ہدایت ان کے مقدر میں ہے نہیں اور جو حکمت تھی وہ حاصل ہوچکی تو اب ان کے اموال اور نفوس کو کیوں باقی رکھا جاوے پس) اے ہمارے رب ان کے مالوں کو نیست نابود کر دیجئے اور ان کے نفوس کی ہلاکت کا سامان کر دیجئے اس طرح کہ) ان کے دلوں کو (زیادہ) سخت کر دیجئے (جس سے ہلاکت کے مستحق ہوجاویں) سو یہ ایمان نہ لانے پاویں (بلکہ روز بروز ان کا کفر ہی بڑھتا رہے) یہاں تک کہ عذاب الیم (کے مستحق ہو کر اس) کو دیکھ لیں (سو اس وقت ایمان نافع نہیں ہوتا، موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا کی اور ہارون علیہ السلام آمین کہتے رہے۔ کذا فی الدر المنثور، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی (کیونکہ آمین کہنا بھی دعا میں شریک ہونا ہے یعنی ہم ان کے اموال و نفوس اب ہلاک کرنے والے ہیں) سو تم (اپنے منصبی کام یعنی تبلیغ پر) مستقیم رہو (یعنی گو ہدایت ان کی تقدیر میں نہ ہو مگر تبلیغ میں تمہارا تو فائدہ ہے) اور ان لوگوں

کی راہ نہ چلنا جن کو (ہمارے وعدے کے سچے ہونے کا یا توقف میں حکمت ہونے کا یا تبلیغ کے ضروری ہونے کا) علم نہیں (یعنی ہمارے وعدہ کو سچا سمجھو اور اگر ہلاکت میں دیر ہو جاوے اس میں حکمت سمجھو اور اپنے منصبی کام میں لگے رہو) اور (جب ہم نے فرعون کو ہلاک کرنا چاہا تو موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے باہر نکال لے جاتیے، چنانچہ وہ سب کو لے کر چلے اور رستہ میں دریائے شور حائل ہوا، اور موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اس میں راستہ ہو گیا اور) ہم نے بنی اسرائیل کو (اس) دریا سے پار کر دیا پھر ان کے پیچھے پیچھے فرعون مع اپنے لشکر کے ظلم اور زیادتی کے ارادہ سے (دریا میں) چلا (کہ دریا سے نکل کر ان سے قتل و قتال کرے لیکن وہ دریا سے پار نہ ہو سکا) یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا (اور ملائکہ عذاب کے نظر آنے لگے) تو (سراسیمہ ہو کر) کہنے لگا میں ایمان لاتا ہوں کہ بجز اس کے کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں کوئی معبود نہیں اور میں مسلمانوں میں داخل ہوتا ہوں (سو مجھ کو اس غرق سے اور عذاب آخرت سے نجات دی جاوے فرشتہ کے ذریعہ سے) جواب دیا گیا کہ اب ایمان لاتا ہے (جبکہ معائنہ آخرت کا شروع ہو گیا) اور (معائنۂ آخرت کے) پہلے سے سرکشی کرتا رہا اور مفسدوں میں داخل رہا (اب نجات چاہتا ہے)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور بنی اسرائیل و قوم فرعون کے کچھ حالات اور ان سے متعلقہ احکام مذکور ہیں۔ پہلی آیت میں ایک خاص واقعہ سے متعلق حکم ہے وہ یہ کہ بنی اسرائیل جو دینِ موسوی پر عامل تھے یہ سب عام عادت کے مطابق نمازیں صرف اپنے صومعوں (عبادت گاہوں) میں ادا کرتے تھے، اور پچھلی امتوں کے لئے حکم بھی یہی تھا کہ ان کی نماز اپنے گھروں میں ادا نہیں ہوتی تھی، یہ خصوصی سہولت امتِ محمدیہ کو عطا ہوئی کہ ہر جگہ جہاں چاہیں نماز ادا کر لیں، صحیح مسلم کی ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چھ خصوصیات میں سے ایک یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ میرے لئے ساری زمین کو مسجد بنا دیا گیا ہے کہ نماز ہر جگہ ادا ہو جاتی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ فرض نمازوں کا مسجدوں میں ہی ادا کرنا جماعت کے ساتھ سنتِ مؤکدہ قرار دیا گیا۔ اور نفلی نمازوں کا گھروں میں ادا کرنا افضل ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اسی پر تھا کہ مسجد میں صرف فرض نماز پڑھتے تھے، سنن اور نوافل گھر میں جا کر ادا فرماتے تھے۔ بنی اسرائیل اپنے مذہب کے مطابق اس کے پابند تھے کہ نماز صرف اپنے عبادت خانوں میں ادا کریں، فرعون جو ان کو طرح طرح کی ایذائیں دیتا اور ان پر ظلم ڈھاتا تھا، اس نے یہ دیکھ کر ان کے تمام عبادت خانوں کو مسمار کر دیا تاکہ یہ اپنے

مذہب کے مطابق نماز نہ پڑھ سکیں، اس پر حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے دونوں پیغمبروں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو وہ حکم دیا جو اس آیت میں مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کیلئے مصر میں مکان نئے بنائے جائیں اور ان مکانات کا رُخ قبلہ کی طرف ہو تاکہ وہ انہیں مکانات میں نماز ادا کر سکیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ پچھلی امتوں میں اگرچہ عام حکم یہی تھا کہ نمازیں صرف عبادتخانوں میں پڑھی جائیں، لیکن اس خاص حادثہ کی وجہ سے بنی اسرائیل کے لئے اس کی عارضی اجازت دے دی گئی کہ گھروں ہی میں نماز ادا کر لیا کریں اور اپنے گھروں کا رخ قبلہ کی طرف سیدھا رکھیں، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس ضرورت کے وقت بھی ان کو خصوص گھروں میں نماز پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی جن کا رُخ قبلہ کی طرف کیا گیا تھا، عام گھروں اور عام مقامات پر نماز کی اجازت اس وقت بھی نہیں تھی، جس طرح امتِ محمدیہ کو شہر اور جنگل کے ہر مقام پر نماز ادا کرنے کی سہولت حاصل ہے (روح)

یہاں یہ سوال بھی قابلِ غور ہے کہ اس آیت میں بنی اسرائیل کو جس قبلہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اُس سے مراد کونسا قبلہ ہے، کعبہ یا بیت المقدس؟ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کعبہ ہے اور کعبہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے اصحاب کا قبلہ تھا، (قرطبی و روح)، بلکہ بعض علماء نے فرمایا کہ تمام انبیاء سابقین کا قبلہ اصل میں کعبہ ہی تھا۔

اور جس حدیث میں یہ ارشاد ہے کہ یہود اپنی نمازوں میں صخرہ بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے ہیں اس کو اس زمانہ پر محمول کیا جائے گا جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر چھوڑ کر بیت المقدس کی طرف روانہ ہوئے، یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ قیامِ مصر کے زمانہ میں آپ کا قبلہ بیت اللہ ہی ہو۔

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نماز کے لئے استقبالِ قبلہ کی شرط انبیاء سابقین کے زمانہ میں بھی تھی، اسی طرح طہارت اور ستر عورت کا تمام انبیاء سابقین کی شریعتوں میں شرطِ نماز ہونا بھی معتبر روایات سے ثابت ہے۔

گھروں کو قبلہ رُخ بنانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ان میں نمازیں ادا کی جائیں اس لئے اس کے بعد اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کا حکم دے کر یہ ہدایت کر دی گئی کہ اگر فرعون عبادت گاہوں میں نماز ادا کرنے سے روکتا ہے تو اس سے نماز ساقط نہیں ہوتی اپنے گھروں میں ادا کرو۔

آخر آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے حکم دیا گیا کہ مؤمنین کو آپ خوشخبری

سنادیں کہ ان کا مقصود پورا ہوگا، دشمن پر ان کو غلبہ نصیب ہوگا اور آخرت میں جنت ملے گی۔ (روح)

آیت کے شروع میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو بصیغۂ تثنیہ خطاب کیا گیا کیونکہ مکانات قبلہ رُخ کرکے انہیں نماز پڑھنے کی اجازت انہیں کا کام تھا، اُس کے بعد بصیغۂ جمع سب بنی اسرائیل کو شامل کرکے اقامتِ نماز کا حکم دیا گیا کیونکہ اس حکم میں پیغمبر اور امت سب داخل ہیں، آخر میں بشارت دینے کا حکم خاص موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا کیونکہ اصل صاحب شریعت نبی آپ ہی تھے، بشارتِ جنت دینے کا آپ ہی کو حق تھا۔

دوسری آیت میں قوم فرعون کی اصلاح سے مایوس ہوکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بددعا کا ذکر ہے جس کے شروع میں انہوں نے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ عرض کیا ہے کہ آپ نے قوم فرعون کو زینتِ دنیا کے ساز و سامان اور مال و دولت بہت عطا فرما رکھا ہے، مصر سے لے کر ارضِ حبشہ تک سونے چاندی اور زبرجد و زمرد یاقوت وغیرہ جواہرات کی کانیں عطا فرما رکھی ہیں (قرطبی) جس کا اثر یہ ہے کہ وہ لوگوں کو تیرے راستہ سے گمراہ کرتے ہیں، کیونکہ عام لوگ ان کے ظاہری ساز و سامان اور عیش و راحت کو دیکھ کر اس شک میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر یہ گمراہی پر ہوتے تو ان کو اللہ تعالیٰ کی یہ نعمتیں کیوں ملتیں، کیونکہ عام لوگوں کی نظریں اس حقیقت تک نہیں پہنچتیں کہ دنیا کا فروغ بغیر نیک عمل کے کسی انسان کے حق پر ہونے کی علامت نہیں ہوسکتی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم فرعون کی اصلاح سے مایوس ہونے کے بعد ان کے مال و دولت سے دوسروں کی گمراہی کا خطرہ محسوس کرکے بددعا کی، رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ یعنی اے میرے پروردگار ان کے اموال کی صورت بدل کر مسخ و بیکار کردے۔

حضرت قتادہؓ کا بیان ہے کہ اس دعا کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ قوم فرعون کے تمام زر و جواہرات اور نقد سکے اور باغوں کھیتوں کی سب پیداوار پتھروں کی شکل میں تبدیل ہوگئے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں ایک تھیلہ پایا گیا جس میں فرعون کے زمانہ کی چیزیں تھیں ان میں انڈے اور بادام بھی دیکھے گئے جو بالکل پتھر تھے۔

ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام پھلوں، ترکاریوں اور غلہ کو پتھر بنا دیا تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کی اُن نو آیات (معجزات) میں سے ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے، وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ۔

دوسری بددعا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے یہ کی، وَاشْدُدْ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ، یعنی اے پروردگار ان کے دلوں کو ایسا سخت

کردے کہ ان میں ایمان اور کسی خیر کی صلاحیت ہی نہ رہے تاکہ وہ عذاب الیم آنے سے پہلے ایمان نہ لاسکیں۔

یہ بددُعا بظاہر ایک رسول و پیغمبر کی زبان سے بہت بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ پیغمبر کا وظیفۂ زندگی ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو ایمان و عملِ صالح کی طرف دعوت دیں اور اس کے لئے تدبیریں کریں۔

مگر یہاں واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ساری تدبیریں کرنے کے بعد ان کی اصلاح سے مایوس ہو چکے تھے اور اب چاہتے تھے کہ یہ اپنے اعمال کی سزا دیکھیں، اس میں یہ احتمال تھا کہ کہیں یہ لوگ عذاب آتا دیکھ کر ایمان کا اقرار نہ کرلیں اور اس طرح عذاب ٹل جائے، اس لئے کفر سے بغض و نفرت اس دعا کا سبب بنی، جیسے فرعون غرق ہونے کے وقت ایمان کا اقرار کرنے لگا تو جبریلِ امین نے اس کا منہ بند کردیا کہ کہیں رحمتِ الٰہی متوجہ ہوکر یہ عذاب سے نہ بچ جائے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بددعا درحقیقت بددعا نہ ہو بلکہ ایسی ہو جیسے شیطان پر لعنت کہ وہ تو بنصِ قرآن خود ہی ملعون ہے پھر اس پر لعنت کرنے کا منشا اس کے سوا نہیں کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت مسلط کردی ہم بھی اس پر لعنت کرتے ہیں اس صورت میں مطلب اس کا یہ ہوگا کہ ان کے دلوں کا سخت اور ناقابلِ ایمان و اصلاح ہونا من جانب اللہ مقرر ہو چکا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بصورتِ بددعا اس کا اظہار فرمایا۔

تیسری آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کی قبولیت کو بیان فرمایا ہے مگر عنوان میں حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی شریکِ دعا قرار دے کر یہ خطاب کیا گیا قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا یعنی تم دونوں کی دعا قبول کرلی گئی، وجہ یہ تھی کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ دُعا کر رہے تھے تو حضرت ہارونؑ آمین کہتے جاتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی دعا پر آمین کہنا بھی دعا ہی میں داخل ہے، اور چونکہ دُعا کا مسنون طریقہ قرآن کریم میں آہستہ آواز سے کرنے کا بتلایا گیا ہے تو اس سے آمین کو بھی آہستہ کہنے کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔

اس آیت میں قبولیتِ دُعا کی اطلاع ان دونوں پیغمبروں کو دیدی گئی، مگر تھوڑا سا امتحان ان کا بھی لیا گیا کہ قبولیتِ دعا کا اثر بقول بغوی چالیس سال بعد ظاہر ہوا، اسی لئے اس آیت میں قبولیتِ دعا کے ذکر کے ساتھ ان دونوں حضرات کو یہ بھی ہدایت کردی گئی کہ فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ، یعنی اپنے کارِ منصبی دعوت و تبلیغ میں لگے رہیں، قبولیتِ دُعا کا اثر دیر میں ظاہر ہو تو جاہلوں کی طرح جلد بازی نہ کریں۔

چوتھی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشہور معجزہ عبورِ دریا کا اور فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ، یعنی جب اس کو غرقابی نے پکڑ لیا تو بول اٹھا کہ میں ایمان لاتا ہوں اس بات پر کہ جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اطاعت کرنے والوں میں سے ہوں۔

پانچویں آیت میں خود حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے اس کا یہ جواب آیا ہے آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ، یعنی کیا اب تم مسلمان ہوتے ہو جب کہ ایمان و اسلام کا وقت گزر چکا۔

اس سے ثابت ہوا کہ عین موت کے وقت کا ایمان لانا شرعاً معتبر نہیں ، اس کی مزید تشریح اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ قبول فرماتے رہتے ہیں جب تک غرغرۂ موت کا وقت نہ آجائے۔ (ترمذی)

غرغرۂ موت سے مراد وہ وقت ہے جب نزعِ روح کے وقت فرشتے سامنے آجاتے ہیں اس وقت دارالعمل دنیا کی زندگی ختم ہو کر آخرت کے احکام شروع ہو جاتے ہیں، اس لئے اس وقت کا کوئی عمل قابلِ قبول نہیں، نہ ایمان نہ کفر، ایسے وقت ہوا ایمان لاتا ہے اس کو بھی مؤمن نہیں کہا جائے گا اور اس کے ساتھ کفن دفن میں مسلمانوں کا سا معاملہ نہ کیا جائے گا، جیسا کہ فرعون کے اس واقعہ سے ثابت ہے کہ بالاجماع فرعون کی موت کفر پر قرار دی گئی ہے نصوصِ قرآن سے بھی یہی واضح ہے اور جس کسی نے فرعون کے اس ایمان کو معتبر کہا ہے یا تو اس کی کوئی تاویل کی جائے ورنہ اسے غلط کہا جائے گا۔ (روح)

اسی طرح اگر خدانخواستہ ایسی ہی نزعِ روح کی حالت میں کسی شخص کی زبان سے کلمۂ کفر نکل جائے تو اس کو کافر بھی نہ کہا جائے گا بلکہ اس کے جنازہ کی نماز پڑھ کر مسلمانوں کی طرح دفن کیا جائے گا اور اس کے کلمۂ کفر کی تاویل کی جائے گی جیسا کہ بعض اولیاء اللہ کے حالات سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ جو کلمہ ان کی زبان سے نکل رہا تھا لوگ اس کو کلمۂ کفر سمجھ کر پریشان تھے بعد میں کچھ ہوش آیا اور اپنا مطلب بتلایا تو سب کو اطمینان ہو گیا کہ وہ عین ایمان کا کلمہ تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس وقت رُوح نکل رہی ہو اور نزع کا عالم ہو وہ وقت دنیا کی زندگی میں شمار نہیں، اس وقت کا کوئی عمل بھی شرعاً معتبر نہیں ، اس سے پہلے پہلے ہر عمل معتبر ہے ، مگر دیکھنے والوں کو اس میں بڑی احتیاط لازم ہے کیونکہ اس کا صحیح اندازہ کرنے میں غلطی ہو سکتی ہے کہ یہ وقت نزعِ روح کا اور غرغرۂ موت کا ہے یا اس سے پہلے کا۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ

سو آج بچائے دیتے ہیں ہم تیرے بدن کو تاکہ ہووے تو اپنے پچھلوں کے واسطے نشانی ، اور بیشک

كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝۹۲ وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ

بہت لوگ ہماری قدرتوں پر توجہ نہیں کرتے ، اور جگہ دی ہم نے

اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا

بنی اسرائیل کو پسندیدہ جگہ اور کھانے کو دیں ستھری چیزیں سو ان میں پھوٹ نہیں پڑی

حَتّٰى جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا

یہاں تک کہ پہنچی ان کو خبر ، بیشک تیرا رب ان میں فیصلہ کرے گا قیامت کے دن جس

كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۹۳ فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ

بات میں کہ ان میں پھوٹ پڑی ، سو اگر تو ہے شک میں اس چیز سے کہ اتاری ہم نے تیری طرف

فَسْـَٔـلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۭ لَقَدْ جَاۗءَكَ الْحَقُّ مِنْ

تو پڑھ ان سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے بیشک آئی ہے تیرے پاس حق بات

رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝۹۴ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ

تیرے رب سے سو تو ہرگز مت ہو شک کرنے والا ، اور مت ہو ان میں جنہوں نے

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۹۵ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ

جھٹلایا اللہ کی باتوں کو پھر تو بھی ہو جائے خرابی میں پڑنے والا ، جن پر ثابت ہو چکی

كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۹۶ وَلَوْ جَاۗءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ

بات تیرے رب کی وہ ایمان نہ لائیں گے ، اگرچہ پہنچیں ان کو ساری نشانیاں جب تک دیکھ لیں عذاب

الْاَلِيْمَ ۝۹۷ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا

دردناک ، سو کیوں نہ ہوئی کوئی بستی کہ ایمان لاتی پھر کام آتا ان کو ایمان لانا مگر

قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ

یونس کی قوم جب وہ ایمان لائی اٹھا لیا ہم نے ان پر سے ذلت کا عذاب دُنیا کی

الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝۹۸

زندگانی میں اور فائدہ پہنچایا ہم نے ان کو ایک وقت تک۔

خلاصۂ تفسیر

سو (بجائے نجاتِ مطلوبہ کے) آج ہم تیری لاش کو (پانی میں بے نشین ہونے سے)

نجات دیں گے تاکہ تو ان کے لئے موجب عبرت ہو جو تیرے بعد (موجود) ہیں (کہ تیری بدحالی اور تباہی دیکھ کر مخالفتِ احکام الٰہیہ سے بچیں)، اور حقیقت یہ ہے کہ (پھر بھی) بہت سے آدمی ہماری (ایسی ایسی) عبرتوں سے غافل ہیں (اور مخالفتِ احکام سے نہیں ڈرتے) اور ہم نے (غرقِ فرعون کے بعد) بنی اسرائیل کو بہت اچھا ٹھکانا رہنے کو دیا (کہ اس وقت تو مصر کے مالک ہو گئے اور ان کی اولاد ہی نسل کو بیت المقدس اور ملکِ شام عمالقہ پر فتح دے کر عطا فرمایا) اور ہم نے ان کو نفیس چیزیں کھانے کو دیں (مصر میں بھی جنت وعیون تھے اور شام کی نسبت بٰرَکْنَا فِیْهَا آیا ہے) سو (چاہئے تھا کہ ہماری اطاعت میں زیادہ سرگرم رہتے لیکن انہوں نے اُلٹا دین میں اختلاف کرنا شروع کیا اور غضب یہ کہ) انہوں نے (جہل کی وجہ سے) اختلاف نہیں کیا یہاں تک کہ ان کے پاس (احکام کا) علم پہنچ گیا (تھا اور پھر اختلاف کیا آگے اس اختلاف پر وعید ہے کہ) یقینی بات ہے کہ آپ کا رب ان (اختلاف کرنے والوں) کے درمیان قیامت کے دن ان امور میں فیصلہ (عملی) کرے گا جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے، پھر (اثباتِ حقیقت دینِ محمدی کے واسطے ہم ایک ایسا کافی طریقہ بتلاتے ہیں کہ غیر صاحب وحی کے لئے تو کیسے کافی نہ ہوگا وہ ایسا ہے کہ آپ صاحب وحی ہیں مگر آپ سے بھی اگر اس کا خطاب بطور قضیۂ شرطیہ کے کیا جاوے تو ممکن ہے اس طرح سے کہ) اگر بالفرض آپ اس (کتاب) کی طرف سے شک (وشبہ) میں ہوں جس کو ہم نے آپ کے پاس بھیجا ہے تو (اس شک کے دفع کا ایک سہل طریقہ یہ بھی ہے کہ) آپ ان لوگوں سے پوچھ دیکھئے جو آپ سے پہلے کی کتابوں کو پڑھتے ہیں (مراد توریت وانجیل ہیں وہ من حیث القراءۃ اس کی پیشین گوئیوں کی بناء پر اس قرآن کے صدق کو بتلا دیں گے) بیشک آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے سچی کتاب آئی ہے آپ ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہوں اور نہ (شک کرنے والوں سے بڑھ کر) ان لوگوں میں ہوں جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا کہیں آپ (نعوذ باللہ) تباہ نہ ہو جاویں یقیناً جن لوگوں کے حق میں آپ کے رب کی (یہ ازلی) بات (کہ یہ ایمان نہ لاویں گے) ثابت ہو چکی ہے وہ (کبھی) ایمان نہ لاویں گے گو ان کے پاس تمام دلائل (مثبتہ حق کے) پہنچ جاویں، جب تک کہ عذاب دردناک کو نہ دیکھ لیں (مگر اس وقت ایمان نافع نہیں ہوتا) چنانچہ (جن بستیوں پر عذاب آچکا ہے ان میں سے) کوئی بستی ایمان نہ لائی کہ ایمان لانا اس کو نافع ہوتا (کیونکہ ان کے ایمان کے ساتھ مشیت متعلق نہ ہوئی تھی) ہاں مگر یونس (علیہ السلام) کی قوم (کہ ان کے ایمان کے ساتھ مشیت متعلق ہوئی تھی، اس لئے وہ عذاب موعود کے آثار ابتدائیہ کو دیکھ کر ایمان لے آئے اور) جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے رسوائی کے عذاب کو دنیوی زندگی

میں ان پر سے ٹال دیا اور ان کو ایک وقتِ خاص (یعنی وقتِ موت تک) خیر خوبی کے ساتھ عیش دیا پس اور قوموں کا ایمان نہ لانا اور قوم یونس علیہ السلام کا ایمان لانا دونوں مشیت سے ہوئے

مَعَارِف وَمَسَائِل

پہلی آیت میں فرعون کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ غرقابی کے بعد ہم تیرے بدن کو پانی سے نکال دیں گے، تاکہ تیرا یہ بدن پچھلے لوگوں کے لئے قدرتِ خداوندی کی نشانی اور عبرت بن جائے۔

اس کا واقعہ یہ ہے کہ دریا سے عبور کرنے کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ہلاک ہونے کی خبر دی تو وہ لوگ فرعون سے کچھ اس قدر مرعوب و مغلوب تھے کہ اس کا انکار کرنے لگے اور کہنے لگے کہ فرعون ہلاک نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کی رہنمائی اور دوسروں کی عبرت کے لئے دریا کی ایک موج کے ذریعہ فرعون کی مردہ لاش کو ساحل پر ڈال دیا جس کو سب نے دیکھا اور اس کے ہلاک ہونے کا یقین آیا، اور اس کی یہ لاش سب کے لئے نمونۂ عبرت بن گئی، پھر معلوم نہیں کہ اس لاش کا کیا انجام ہوا، جس جگہ فرعون کی لاش پائی گئی تھی آج تک وہ جگہ بُبَل فرعون کے نام سے معروف ہے۔

کچھ عرصہ ہوا اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی کہ فرعون کی لاش صحیح سالم برآمد ہوئی اور عام لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا، اور وہ آج تک قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے، مگر یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ وہی فرعون ہے جس کا مقابلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوا تھا یا کوئی دوسرا فرعون ہے کیونکہ لفظ فرعون کسی ایک شخص کا نام نہیں، اس زمانے میں مصر کے ہر بادشاہ کو فرعون کا لقب دیا جاتا تھا۔

مگر کچھ عجب نہیں کہ قدرت نے جس طرح غرق شدہ لاش کو عبرت کے لئے کنارہ پر ڈال دیا تھا اسی طرح آئندہ نسلوں کی عبرت کے لئے اس کو گلنے سڑنے سے بھی محفوظ رکھا ہو، اور اب تک موجود ہو۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا کہ بہت سے لوگ ہماری آیتوں اور نشانیوں سے غافل ہیں ان میں غور و فکر نہیں کرتے اور عبرت حاصل نہیں کرتے ورنہ عالم کے ہر ذرہ ذرہ میں ایسی نشانیاں موجود ہیں جن کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو اور اس کی قدرتِ کاملہ کو پہچانا جاسکتا ہے۔

دوسری آیت میں فرعون کے انجام بد کے بالمقابل اس قوم کا مستقبل دکھلایا ہے جس کو فرعون نے حقیر و ذلیل بنا رکھا تھا، فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو اچھا ٹھکانہ عطا فرمایا کہ

پورا ملکِ مصر بھی ان کو مل گیا اور اردن و فلسطین کی ارضِ مقدسہ بھی ان کو مل گئی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذریت کے لئے میراث بنا دیا تھا، اچھے ٹھکانے کو قرآن میں مُبَوَّاَ صِدْقٍ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، صِدق کے معنیٰ اس جگہ صالح اور مناسب کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ایسا ٹھکانا ان کو دیا جو ان کے لئے ہر اعتبار سے لائق اور مناسب تھا پھر فرمایا کہ ہم نے اُن کو حلال و پاک چیزوں سے رزق دیا کہ دنیا کی تمام لذائذ اور راحتیں ان کو عطا فرمادیں۔

آخر آیت میں پھر ان کی کجروی اور غلط کاری کا ذکر ہے کہ ان میں بھی بہت سے لوگوں نے اقتدار پانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہ کی اور اس کی اطاعت سے پھر گئے اور ان میں جو نشانیاں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لوگ پڑھتے تھے اس کا تقاضہ یہ تھا کہ آپ کے تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے یہی لوگ ایمان لاتے، مگر یہ عجیب اتفاق ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے تو یہ سب لوگ نبی آخر الزمان پر اعتقاد رکھتے اور ان کی نشانیوں اور ان کے ظہور کا وقت قریب ہونے کی خبریں لوگوں کو بتایا کرتے تھے اور اپنی دعاؤں میں نبی آخر الزمان کا وسیلہ دے کر دعا کیا کرتے تھے مگر جب نبی آخر الزمان اپنی پوری شہادتوں کے ساتھ اور تورات کی بتلائی ہوئی نشانیوں کے ساتھ تشریف لائے تو یہ لوگ آپس میں اختلاف کرنے لگے، کچھ لوگ ایمان لائے باقیوں نے انکار کیا، اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کو لفظ جَآءَهُمُ الْعِلْمُ سے تعبیر کیا ہے، یہاں عِلْم سے مراد یقین بھی ہو سکتا ہے تو معنیٰ یہ ہوں گے کہ جب مشاہدہ کے ساتھ یقین کے اسباب جمع ہو گئے تو یہ لوگ اختلاف کرنے لگے۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ عِلْم سے مراد معلوم ہے یعنی جب وہ ہستی سامنے آگئی جو تورات کی پیشین گوئیوں کے ذریعہ پہلے سے معلوم تھی تو اب لگے اختلاف کرنے۔

آخر آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان کے اختلاف کا فیصلہ فرما دیں گے حق و باطل نکھر جائے گا، اہل حق جنت میں اور اہل باطل دوزخ میں بھیجے جائیں گے۔

تیسری آیت میں بظاہر خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ آپ کو وحی میں شک ہونے کا احتمال نہیں، اس لئے اس خطاب کے ذریعہ مقصود امت کو سُنانا ہے خود آپ مقصود نہیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خطاب عام انسان کو ہو، کہ اے انسان اگر تجھ کو اُس وحی الٰہی میں کوئی شک ہے جو بواسطہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تیری طرف بھیجی گئی تو تُو اُن لوگوں سے دریافت کر جو تجھ سے پہلے اللہ کی کتاب تورات و انجیل پڑھتے تھے

وہ تجھے بتلائیں گے کہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابیں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشخبری دیتی آئی ہیں، جس سے تیرے وساوس دُور ہو جائیں گے۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو دین کے معاملہ میں کوئی شبہ پیش آجائے تو اس پر لازم ہے کہ علماءِ حق سے سوال کر کے اپنے شبہات دور کرے اُن کی پرورش نہ کرتا رہے۔

چوتھی، پانچویں اور چھٹی آیتوں میں اسی مضمون کی تائید و تاکید اور غفلت برتنے والوں کو تنبیہ ہے۔

ساتویں آیت میں غفلت شعار منکرین کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ زندگی کی فرصت کو غنیمت جانو، انکار و سرکشی سے اب بھی باز آجاؤ، ورنہ ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب توبہ کرو گے تو توبہ قبول نہ ہوگی، ایمان لاؤ گے تو ایمان مقبول نہ ہوگا اور وہ وقت وہ ہوگا جبکہ موت کے وقت آخرت کا عذاب سامنے آجائے، اسی سلسلہ میں حضرت یونس علیہ السلام اور ان کی قوم کا ایک واقعہ ذکر فرمایا گیا جس میں بڑی عبرتیں اور نصیحتیں ہیں۔

اس آیت میں ارشاد ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ منکر قومیں ایسے وقت ایمان لے آتیں کہ ان کا ایمان ان کو نفع دیتا یعنی موت کے وقت یا وقوع عذاب اور مبتلاء عذاب ہو چکنے کے بعد یا قیام قیامت کے وقت جب کہ توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا کسی کی توبہ اور ایمان مقبول نہ ہوگا، اُس سے پہلے پہلے اپنی سرکشی سے باز آجاتیں اور ایمان لے آتیں، بجز قوم یونس علیہ السلام کے کہ انہوں نے ایسا وقت آنے سے پہلے ہی جب خدا تعالیٰ کا عذاب آتا دیکھا تو فوراً توبہ کر لی اور ایمان لے آئے، جس کی وجہ سے ہم نے اُن سے رسوا کرنے والا عذاب ہٹا لیا۔

اس تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کا عذاب سامنے آجانے پر بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوتا بلکہ توبہ قبول ہو سکتی ہے، البتہ آخرت کا عذاب سامنے آجانے کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی اور عذاب آخرت کا سامنے آنا یا قیامت کے دن ہونا یا موت کے وقت، خواہ وہ طبعی موت ہو یا کسی دنیوی عذاب میں مبتلا ہو کر ہو جیسے فرعون کو پیش آیا۔

اس لئے قوم یونس علیہ السلام کی توبہ قبول ہو جانا عام ضابطہ الٰہیہ کے خلاف نہیں بلکہ اس کے ماتحت ہے کیونکہ اُنہوں نے اگرچہ عذاب آتا ہوا دیکھ کر توبہ کی مگر عذاب میں مبتلا ہونے اور موت سے پہلے کر لی، بخلاف فرعون اور دوسرے لوگوں کے جنہوں نے عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد اور غرغرۂ موت کے وقت توبہ کی اور ایمان کا اقرار کیا اس لئے ان کا ایمان معتبر نہ ہوا اور توبہ قبول نہ ہوئی۔

قومِ یونس علیہ السلام کے واقعہ کی ایک نظیر خود قرآن کریم میں بنی اسرائیل کا وہ واقعہ ہے جس میں کوہِ طور کو ان کے سروں پر مُعلّق کر کے انکو ڈرایا گیا اور توبہ کرنے کا حکم دیا گیا انہوں نے توبہ کرلی تو وہ توبہ قبول ہوئی، جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں آیا ہے۔

رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ ۔ ہم نے ان کے سروں پر کوہِ طور کو معلق کر کے حکم دیا کہ جو احکام ہم نے تمہیں دیئے گئے ہیں ان کو مضبوطی سے پکڑو۔

وجہ یہ تھی کہ انہوں نے عذاب کے واقع ہونے اور موت میں مبتلا ہونے سے پہلے محض عذاب کا اندیشہ دیکھ کر توبہ کرلی تھی، اسی طرح قومِ یونس علیہ السلام نے عذاب کو آتا ہوا دیکھ کر اخلاص اور الحاح وزاری کے ساتھ توبہ کرلی جس کی تفصیل آگے آتی ہے تو اس توبہ کا قبول ہوجانا ضابطۂ مذکورہ کے خلاف نہیں (قرطبی)

اس جگہ بعض معاصرین سے ایک سخت غلطی ہوئی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی طرف فریضۂ رسالت ادا کرنے میں کوتاہیوں کی نسبت کردی اور قوم سے عذاب ہٹ جانے کا سبب پیغمبر کی کوتاہی کو قرار دیا، اور اسی کوتاہی کو سببِ عتاب بنایا جس کا ذکر سورۂ انبیاء اور سورۂ صٰفّٰت میں آیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

"قرآن کے اشارات اور صحیفۂ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہوجاتی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے فریضۂ رسالت ادا کرنے میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں اور غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر چھوڑ دیا تھا اس لئے جب آثارِ عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ و استغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کردیا، قرآن میں خدائی دستور کے جو اصول و کلیات بیان کئے گئے ہیں ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اسوقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حجت پوری نہیں کردیتا پس جب نبی ادائے رسالت میں کوتاہی کر گیا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے خود ہی اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا: اھ (تفہیم القرآن[1] مولانا مودودی ص ۳۱۲ ج ۲ - طبع ۱۹۶۴ء)

یہاں سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا گناہوں سے معصوم ہونا تو ایک مسلمہ عقیدہ ہے جس پر تمام اُمت کا اجماع ہے، اسکی تفصیلات میں کچھ جزوی اختلاف بھی ہیں کہ یہ عصمت ہر قسم کے صغیرہ گناہوں سے ہے یا صرف کبیرہ سے اور

[1] تفہیم القرآن کے بعد کے اڈیشنوں میں اس عبارت سے کسی رجوع کے اعلان کے بغیر یہاں عبارت میں معمولی تبدیلی کی گئی ہے یعنی فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کے الفاظ نئی عبارت میں موجود نہیں ہیں، لیکن یہ بات اب بھی عبارت میں باقی ہے کہ جب نبی نے اس قوم کی مہلت کے آخری لمحہ تک نصیحت کا سلسلہ جاری نہ رکھا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطورِ خود ہی وہ ہجرت کر گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اسکی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا، کیونکہ اس پر اتمامِ حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں۔ لہٰذا تفہیم القرآن کی عبارت میں تبدیلی کے باوجود "معارف القرآن" کا تبصرہ علیٰ حالہٖ برقرار ہے۔ ناشر، ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۱ء

یہ کہ یہ عصمت قبل از نبوت کے زمانے کو بھی شامل ہے یا نہیں، لیکن اس میں کسی فرقہ کسی شخص کا اختلاف نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب ادائے رسالت کے فریضہ میں کبھی کوتاہی نہیں کرسکتے، کیونکہ انبیاء کے لئے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہوسکتا کہ جس منصب کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کا انتخاب فرمایا ہے خود اسی میں کوتاہی کر بیٹھیں، یہ تو فرضِ منصبی میں کھلی ہوئی خیانت ہے جو عام شریف انسانوں سے بھی بعید ہے، اس کوتاہی سے بھی اگر پیغمبر معصوم نہ ہوا تو پھر دوسرے گناہوں سے عصمت بے فائدہ ہے۔

قرآن وسنت کے مسلمہ اصول اور اجماعی عقیدہ عصمتِ انبیاء کے بظاہر خلاف اگر کسی جگہ قرآن وحدیث میں بھی کوئی بات نظر آتی تو اصول مسلمہ کی رو سے ضروری تھا کہ اس کی تفسیر و معنیٰ کی ایسی توجیہ تلاش کی جاتی، جس سے وہ قرآن وحدیث کے قطعی الثبوت اصول سے متصادم ومختلف نہ رہے۔

مگر یہاں تو عجیب بات یہ ہے کہ مصنفِ موصوف نے جس بات کو قرآنی اشارات اور صحیفۂ یونس کی تفصیلات کے حوالہ سے پیش کیا ہے وہ صحیفۂ یونس میں ہو تو ہو جس کا اہلِ اسلام میں کوئی اعتبار نہیں، قرآنی اشارہ تو ایک بھی نہیں، بلکہ ہوا یہ کہ کئی مقدمے جوڑ کر یہ نتیجہ زبردستی نکالا گیا ہے، پہلے تو یہ فرض کرلیا گیا کہ قومِ یونس علیہ السلام سے عذاب کا ٹل جانا خدائی دستور کے خلاف واقع ہوا جو خود اسی آیت کے سیاق وسباق کے بھی بالکل خلاف ہے اور اہلِ تحقیق ائمۂ تفسیر کی تصریحات کے بھی خلاف ہے، اس کے ساتھ یہ فرض کرلیا گیا کہ خدائی قانون کو اس موقعہ پر اس لئے توڑا گیا تھا کہ خود پیغمبر سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہوگئی تھیں، اس کے ساتھ یہ بھی فرض کرلیا کہ پیغمبر کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص وقت نکلنے کا مقرر کردیا گیا تھا، وہ اس وقت مقرر سے پہلے فریضۂ دعوت کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، اگر ذرا بھی غور وانصاف سے کام لیا جائے تو ثابت ہوجائے گا کہ قرآن وحدیث کا کوئی اشارہ ان فرضی مقدمات کی طرف نہیں پایا جاتا۔

خود آیتِ قرآن کے سیاق پر غور کیجئے تو الفاظ آیت کے یہ ہیں:

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۔

جس کا مفہوم صاف یہ ہے کہ دنیا کے عام بستی والوں کے متعلق بطور اظہارِ افسوس یہ ارشاد ہے کہ وہ ایسے کیوں نہ ہوگئے کہ ایمان اس وقت لے آتے جس وقت تک ایمان مقبول اور نافع ہوتا ہے یعنی عذاب میں یا موت میں مبتلا ہونے سے پہلے پہلے ایمان لے آتے تو ان کا ایمان قبول ہوجاتا، مگر قومِ یونس اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہ آثارِ عذاب دیکھ کر عذاب میں مبتلا ہونے سے

پہلے ہی ایمان لے آئی تو ان کا ایمان اور توبہ قبول ہوگئی۔

آیت کا یہ واضح مفہوم خود بتلا رہا ہے کہ یہاں کوئی خدائی قانون نہیں توڑا گیا بلکہ عین خدائی دستور کے مطابق ان کا ایمان اور توبہ قبول کرلی گئی ہے۔

اکثر مفسرین بحر محیط، قرطبی، زمخشری، مظہری، روح المعانی وغیرہ نے آیت کا یہی مفہوم لکھا ہے جس میں قوم یونسؑ کی توبہ قبول ہونا عام قانون الٰہی کے تحت ہے، قرطبی کے الفاظ یہ ہیں:

وقال ابن جُبَیر غشیھم العذاب کما یغشی الثوبُ القبرَ فلما صحت توبتھم رفع اللہ عنھم العذاب وقال الطبری خص قوم یونسؑ من بین سائر الامم بان تِیْبَ علیھم بعد معاینۃ العذاب وذکر ذلک عن جماعۃ من المفسرین وقال الزجاج انھم لم یقع بھم العذاب وانما رأوا العلامۃ التی تدلُّ علی العذاب ولو رأوا عین العذاب لما نفعھم ایمانھم۔ قلت قول الزجاج حسنٌ فان المعاینۃ التی لا تنفع التوبۃُ معھا ھی التلبّس بالعذاب کقصۃ فرعون ولھذا جاء بقصۃ قوم یونسؑ علی اثر قصۃ فرعون ویعضد ھذا قولہ علیہ السلام ان اللہ یقبل توبۃ العبد مالم یُغَرْغِرْ والغَرْغَرَۃُ الشَّرْجَۃ وذلک ھو حال التلبس بالموت وقد روی معنی ما قلناہ عن ابن مسعودؓ (الی) وھذا یدل علی ان توبتھم قبل رؤیۃ العذاب (الی) وعلی ھذا فلا اشکال ولا تعارض ولا خصوص۔

(ترجمہ) ابن جبیر کہتے ہیں کہ عذاب نے ان کو اس طرح ڈھانپ لیا تھا جیسے قبر پر چادر پھر چونکہ ان کی توبہ صحیح ہوگئی (کہ وقوعِ عذاب سے پہلے تھی) تو ان کا عذاب اٹھا دیا گیا۔ طبری فرماتے ہیں کہ قوم یونسؑ کو تمام اقوامِ عالم سے یہ خصوصیت دی گئی ہے کہ معاینۂ عذاب کے بعد ان کی توبہ قبول کرلی گئی، زجاج نے فرمایا کہ ان لوگوں پر ابھی عذاب پڑا نہیں تھا بلکہ علاماتِ عذاب دیکھی تھیں اور اگر عذاب پڑ جاتا تو ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوتی، قرطبی فرماتے ہیں کہ زجاج کا قول اچھا اور بہتر ہے کیونکہ جس معاینہ عذاب کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی وہ وہ ہے کہ عذاب میں مبتلا ہو جائے جیسا واقعہ فرعون میں پیش آیا، اور اسی لئے اس سورت میں قوم یونس کا واقعہ فرعون کے واقعہ کے بعد متصلاً ذکر فرمایا تاکہ فرق واضح ہو جائے کہ فرعون کا ایمان بلاء عذاب کے بعد تھا بخلاف قوم یونسؑ کے کہ وہ وقوعِ عذاب سے پہلے ہی ایمان لے آئی، اس بات کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتا ہے جبتک وہ غرغرہ کی حالت میں نہ پہونچ جائے، اور غرغرہ موت کے وقت طاری ہونے والے سکرات کو کہتے ہیں اور یہی بات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے معلوم ہوتی ہے جس میں بتلایا ہے کہ قوم یونس نے وقوعِ عذاب سے پہلے توبہ کرلی تھی، قرطبی فرماتے ہیں کہ اس تقریر و تفسیر پر نہ کوئی اشکال ہے نہ تعارض نہ قوم یونس کی تخصیص۔

اور طبری وغیرہ مفسرین نے بھی جو اس واقعہ کو قوم یونسؑ کی خصوصیت بتلایا ہے ان میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس خصوصیت کا سبب یونسؑ علیہ السلام کی کوتاہیاں تھیں بلکہ اس قوم کا سچے دل سے توبہ کرنا اور علم الٰہی میں مخلص ہونا، وغیرہ وجوہات لکھی ہیں۔

اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ قوم یونس علیہ السلام کا عذاب ٹل جانا عام قانونِ قدرت کے خلاف ہی نہیں تھا بلکہ عین مطابق تھا تو اس کلام کی بنیاد ہی ختم ہوگئی۔

اسی طرح کسی قرآنی اشارے سے یہ ثابت نہیں کہ عذاب کی وعید سنانے کے بعد یونس علیہ السلام بغیر اذنِ خداوندی اپنی قوم سے الگ ہوگئے بلکہ سیاق آیات اور تفسیری روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسا تمام سابق امتوں کے ساتھ معاملہ ہوتا آیا تھا کہ جب ان کی امت پر عذاب آنے کا فیصلہ کرلیا جاتا تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور ان کے ساتھیوں کو یہاں سے نکل جانے کا حکم دے دیتے تھے جیسا لوط علیہ السلام کا واقعہ بتصریح قرآن میں مذکور ہے، اسی طرح یہاں بھی جب اللہ کا یہ حکم یونس علیہ السلام کے ذریعہ ان لوگوں کو پہنچا دیا گیا کہ تین دن کے بعد عذاب آئے گا تو یونس علیہ السلام کا اس جگہ سے نکل جانا ظاہر یہی ہے کہ بامرِ خداوندی ہوا ہے۔

البتہ یونس علیہ السلام سے جو پیغمبرانہ شان کے اعتبار سے ایک لغزش ہوئی اور اس پر سورۂ انبیاء اور سورۂ صٰفّٰت کی آیتوں میں عتاب کے الفاظ آئے اور اسی کے نتیجہ میں مچھلی کے پیٹ میں رہنے کا واقعہ پیش آیا، وہ یہ نہیں کہ انہوں نے فریضۂ رسالت میں کوتاہی کردی تھی بلکہ واقعہ وہ ہے جو اوپر مستند تفسیروں کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ جب یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کے حکم کے مطابق تین دن کے بعد عذاب کے آنے کی وعید سنا دی اور پھر باذنِ الٰہی اپنی جگہ کو چھوڑ کر باہر چلے گئے اور بعد میں یہ ثابت ہوا کہ عذاب نہیں آیا تو اب یونس علیہ السلام کو اس کی فکر لاحق ہوئی کہ میں اپنی قوم میں واپس جاؤں گا تو جھوٹا قرار دیا جاؤں گا اور اس قوم کا یہ دستور تھا کہ جس کا جھوٹ ثابت ہو جائے اس کو قتل کردیں تو اب اپنی قوم کی طرف لوٹ کر جانے میں جان کا بھی اندیشہ ہوا، ایسے وقت بجز اس کے کوئی راستہ نہ تھا کہ اب اس وطن ہی سے ہجرت کر جائیں لیکن سنّت انبیاء علیہم السلام کی یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کی اجازت نہ آجائے محض اپنی رائے سے ہجرت نہیں کرتے تو یونس علیہ السلام کی لغزش یہ تھی کہ اللہ کی اجازت آنے سے پہلے ہجرت کا قصد کرکے کشتی پر سوار ہوگئے جو اگرچہ اپنی ذات میں کوئی گناہ نہیں تھا مگر سنتِ انبیاء سے مختلف تھا، اگر آیاتِ قرآن کے الفاظ میں غور کریں تو یونس علیہ السلام کی لغزش فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی

کوتاہی نہیں بلکہ قوم کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے ہجرت قبل الاذن کے سوا اور کچھ نہیں ثابت ہوگی، سورۂ صٰفّٰت کی آیت اس مضمون کے لئے تقریباً صریح ہے، جس میں فرمایا ہے اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ، اس میں بقصدِ ہجرت کشتی پر سوار ہونے کو اَبَقَ کے لفظ سے بطور عتاب کے تعبیر کیا گیا ہے، جس کے معنیٰ ہیں کسی غلام کا اپنے آقا کی اجازت کے بغیر بھاگ جانا اور سورۂ انبیاء کی آیت میں ہے وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ جس میں طبعی خوف کی بناء پر قوم سے جان بچا کر ہجرت کرنے کو بطور عتاب کے اس شدید عنوان سے بیان فرمایا ہے، اور یہ سب فرائض رسالت کی مکمل ادائیگی کے بعد اس وقت پیش آیا جب کہ اپنی قوم میں واپس جانے سے جان کا خطرہ لاحق ہوگیا، تفسیر رُوح المعانی میں یہی مضمون بالفاظِ ذیل لکھا ہے:

ای غضبان علٰی قومه لشدة شكيمتهم وتمادی اصرارهم مع طول دعوته اياهم وكان ذهابه هٰذا سهم هجرة عنهم لكنه لم يؤمر به۔	یعنی یونس علیہ السلام اپنی قوم سے ناراض ہوکر اس لئے چل دیئے کہ قوم کی شدید مخالفت اور اپنے کفر پر اصرار کے باوجود زمانہ دراز تک دعوت رسالت پہنچاتے رہنے کا مشاہدہ کر چکے تھے اور ان کا یہ سفر ہجرت کے طور پر تھا مگر ابھی تک ان کو ہجرت کی اجازت نہیں ملی تھی۔

اس میں واضح کردیا ہے کہ دعوت ورسالت میں کوئی کوتاہی سبب عتاب نہیں تھی بلکہ قبل از اجازت ہجرت کرنا سبب عتاب بنا ہے جو فی نفسہٖ کوئی گناہ نہ تھا مگر سنتِ انبیاء کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس پر عتاب آیا ہے، معاصر موصوف کو بعض علماء نے اس غلطی پر متنبہ فرمایا تو سورۂ صٰفّٰت کی تفسیر میں انہوں نے اپنے موقف کی حمایت وتائید میں بہت سے مفسرین کے اقوال بھی نقل فرمائے ہیں جن میں وہب بن منبہ وغیرہ کی بعض اسرائیلی روایتوں کے سوا کسی سے ان کا یہ موقف صحیح ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت یونس علیہ السلام سے معاذ اللہ فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہوگئی تھیں۔

اور یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں کہ عام طور پر حضرات مفسرین اپنی تفسیروں میں اسرائیلی روایات بھی نقل کردیتے ہیں جن کے بارے میں ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ روایات مستند ومعتبر نہیں، کسی حکم شرعی کا ان پر مدار نہیں رکھا جاسکتا، اسرائیلی روایات خواہ مفسرین اسلام کی کتابوں میں ہوں یا صحیفۂ یونس میں صرف انہیں کے سہارے حضرت یونس علیہ السلام پر یہ بہتانِ عظیم لگایا جاسکتا ہے کہ ان سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہوگئی تھیں اور کسی مفسر اسلام نے اس کو قبول نہیں کیا، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم وبہ استغیث ان یعصمنا من الخطایا والزلات،

حضرت یُونس علیہ السّلام کا مفصّل واقعہ

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ جس کا کچھ حصہ تو خود قرآن میں مذکور ہے اور کچھ روایاتِ حدیث وتاریخ سے ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت یُونس علیہ السلام کی قوم عراق میں موصل کے مشہور مقام نینوٰی میں بستی تھی، ان کی تعداد قرآن کریم میں ایک لاکھ سے زیادہ بتلائی ہے ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے یُونس علیہ السلام کو بھیجا، انہوں نے ایمان لانے سے انکار کیا، حق تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو آگاہ کردو کہ تین دن کے اندر اندر تم پر عذاب آنے والا ہے، حضرت یونسؑ نے قوم میں اس کا اعلان کردیا، قوم یونسؑ نے آپس میں مشورہ کیا تو اس پر سب کا اتفاق ہوا کہ ہم نے کبھی یونس علیہ السلام کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا اس لئے ان کی بات نظرانداز کرنے کے قابل نہیں، مشورہ میں یہ طے ہوا کہ یہ دیکھا جائے کہ یونس علیہ السلام رات کو ہمارے اندر اپنی جگہ مقیم رہتے ہیں تو سمجھ لو کہ کچھ نہیں ہوگا اور اگر وہ یہاں سے کہیں چلے گئے تو یقین کرلو کہ صبح کو ہم پر عذاب آئے گا، حضرت یونسؑ بارشادِ خداوندی رات کو اس بستی سے نکل گئے، صبح ہوئی تو عذاب الٰہی ایک سیاہ دھوئیں اور بادل کی شکل میں ان کے سروں پر منڈلانے لگا اور فضاء آسمانی سے نیچے ان کے قریب ہونے لگا تو ان کو یقین ہوگیا کہ اب ہم سب ہلاک ہونے والے ہیں، یہ دیکھ کر حضرت یونسؑ کو تلاش کیا کہ ان کے ہاتھ پر مشرف بایمان ہوجائیں اور پچھلے انکار سے توبہ کرلیں مگر یونس علیہ السلام کو نہ پایا تو خود ہی اخلاصِ نیت کے ساتھ توبہ واستغفار میں لگ گئے، بستی سے ایک میدان میں نکل آئے، عورتیں بچے اور جانور سب اس میدان میں جمع کردیئے گئے، ٹاٹ کے کپڑے پہن کر عجز وزاری کے ساتھ اس میدان میں توبہ کرنے اور عذاب سے پناہ مانگنے میں اس طرح مشغول ہوئے کہ پورا میدان آہ وبکا سے گونجنے لگا، اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور عذاب ان سے ہٹادیا جیسا کہ اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، روایات میں ہے کہ یہ عاشورا یعنی دسویں محرم کا دن تھا۔

ادھر حضرت یونس علیہ السلام بستی سے باہر اس انتظار میں تھے کہ اب اس قوم پر عذاب نازل ہوگا، ان کے توبہ واستغفار کا حال ان کو معلوم نہ تھا، جب عذاب ٹل گیا تو ان کو فکر ہوئی کہ مجھے جھوٹا قرار دیا جائے گا کیونکہ میں نے اعلان کیا تھا کہ تین دن کے اندر عذاب آجائے گا، اس قوم میں قانون یہ تھا کہ جس شخص کا جھوٹ معلوم ہو اور وہ اپنے کلام پر کوئی شہادت نہ پیش کرے تو اس کو قتل کردیا جاتا تھا، یُونس علیہ السلام کو فکر ہوئی کہ مجھے جھوٹا قرار دے کر قتل کردیا جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام ہر گناہ و معصیت سے معصوم ہوتے ہیں مگر انسانی فطرت و طبیعت سے جدا نہیں ہوتے، اس وقت یونس علیہ السلام کو طبعی طور پر یہ ملال ہوا کہ میں نے بحکم الٰہی اعلان کیا تھا اور اب میں اعلان کی وجہ سے جھوٹا قرار دیا جاؤں گا، اپنی جگہ واپس جاؤں تو کس منہ سے جاؤں اور قوم کے قانون کے مطابق گردن زدنی بنوں، اس رنج و غم اور پریشانی کے عالم میں اس شہر سے نکل جانے کا ارادہ کر کے چل دیئے یہاں تک کہ بحر روم کے کنارہ پر پہنچ گئے وہاں ایک کشتی دیکھی جس میں لوگ سوار ہو رہے تھے، یونس علیہ السلام کو ان لوگوں نے پہچان لیا اور بغیر کرایہ کے سوار کر لیا، کشتی روانہ ہو کر جب وسط دریا میں پہنچ گئی تو دفعۃً ٹھہر گئی، نہ آگے بڑھتی ہے نہ پیچھے چلتی ہے، کشتی والوں نے منادی کی کہ ہماری اس کشتی کی من جانب اللہ یہی شان ہے کہ جب اس میں کوئی ظالم گناہگار یا بھاگا ہوا غلام سوار ہو جاتا ہے تو یہ کشتی خود بخود رک جاتی ہے، اس آدمی کو ظاہر کر دینا چاہئے تاکہ ایک آدمی کی وجہ سے سب پر مصیبت نہ آئے۔

حضرت یونس علیہ السلام بول اٹھے کہ وہ بھاگا ہوا غلام گناہگار میں ہوں، کیونکہ اپنے شہر سے غائب ہو کر کشتی میں سوار ہونا ایک طبعی خوف کی وجہ سے تھا باذن الٰہی نہ تھا، اس بغیر اذن کے اس طرف آنے کو حضرت یونس علیہ السلام کی پیغمبرانہ شان نے ایک گناہ قرار دیا کہ پیغمبر کی کوئی نقل و حرکت بلا اذن کے نہ ہونی چاہئے تھی اس لئے فرمایا کہ مجھے دریا میں ڈال دو تو تم سب اس عذاب سے بچ جاؤ گے، کشتی والے اس پر تیار نہ ہوئے بلکہ انہوں نے قرعہ اندازی کی تاکہ قرعہ میں جس کا نام نکل آئے اس کو دریا میں ڈال جائے، اتفاقاً قرعہ میں حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکل آیا، ان لوگوں کو اس پر تعجب ہوا تو کئی مرتبہ قرعہ اندازی کی ہر مرتبہ بحکم قضاء وقدر حضرت یونس علیہ السلام کا ہی نام آتا رہا، قرآن کریم میں اس قرعہ اندازی اور اس میں یونس علیہ السلام کا نام نکلنے کا ذکر موجود ہے فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ۔

یونس علیہ السلام کے ساتھ حق تعالیٰ کا یہ معاملہ ان کے مخصوص پیغمبرانہ مقام کی وجہ سے تھا کہ اگرچہ انہوں نے اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی جس کو گناہ اور معصیت کہا جاتا ہے اور کسی پیغمبر سے اس کا امکان نہیں، کیونکہ وہ معصوم ہوتے ہیں لیکن پیغمبر کے مقام بلند کے مناسب نہ تھا کہ محض خوف طبعی سے کسی جگہ بغیر اذن خداوندی منتقل ہو جاویں، اس خلاف شان عمل پر بطور عتاب یہ معاملہ کیا گیا۔

اس طرف قرعہ میں نام نکل کر دریا میں ڈالے جانے کا سامان ہو رہا تھا دوسری طرف ایک بہت بڑی مچھلی بحکم خداوندی کشتی کے قریب منہ پھیلائے ہوئے لگی ہوئی تھی کہ یہ دریا میں

آئیں تو ان کو اپنے پیٹ میں جگہ دے، جس کو حق تعالیٰ نے پہلے سے حکم دے رکھا کہ یونس علیہ السلام کا جسم جو تیرے پیٹ کے اندر رکھا جائے گا یہ تیری غذا نہیں بلکہ ہم نے تیرے پیٹ کو ان کا مسکن بنایا ہے، یونس علیہ السلام دریا میں گئے تو فوراً اس مچھلی نے منہ میں لے لیا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ یونس علیہ السلام اس مچھلی کے پیٹ میں چالیس روز رہے یہ ان کو زمین کی تہ تک لے جاتی اور دور دراز کی مسافتوں میں پھراتی رہی، بعض حضرات نے سات، بعض نے پانچ دن اور بعض نے ایک دن کے چند گھنٹے مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی مدت بتلائی ہے (مظہری) حقیقت حال حق تعالیٰ کو معلوم ہے، اس حالت میں حضرت یونس علیہ السلام نے یہ دعاء کی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ، اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمایا اور بالکل صحیح وسالم حضرت یونس علیہ السلام کو دریا کے کنارے پر ڈال دیا۔

مچھلی کے پیٹ کی گرمی سے ان کے بدن پر کوئی بال نہ رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے قریب ایک کدو (لوکی) کا درخت اگا دیا، جس کے پتوں کا سایہ بھی حضرت یونس علیہ السلام کیلئے ایک راحت بن گئی، اور ایک جنگلی بکری کو اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمادیا کہ وہ صبح و شام ان کے پاس آکھڑی ہوتی اور وہ اس کا دودھ پی لیتے تھے۔

اس طرح حضرت یونس علیہ السلام کو اس لغزش پر تنبیہ بھی ہو گئی، اور بعد میں ان کی قوم کو بھی پورا حال معلوم ہو گیا۔

اس قصہ میں جتنے اجزاء قرآن میں مذکور یا مستند روایات حدیث سے ثابت ہیں وہ تو یقینی ہیں باقی اجزاء تاریخی روایات کے ہیں جن پر کسی شرعی مسئلہ کا مدار نہیں رکھا جا سکتا۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ

اور اگر تیرا رب چاہتا بیشک ایمان لے آتے جتنے لوگ کہ زمین میں ہیں سارے تمام، اب کیا تو

تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۹۹ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ

زبردستی کرے گا لوگوں پر کہ ہو جائیں باایمان ، اور کسی سے نہیں ہو سکتا

اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَي الَّذِيْنَ

کہ ایمان لائے مگر اللہ کے حکم سے ، اور وہ ڈالتا ہے گندگی ان پر جو

لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۰

نہیں سوچتے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (ان اقوام و قرای کی کیا تخصیص ہے، اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے (مگر بعض حکمتوں کی وجہ سے یہ نہ چاہا اس لئے سب ایمان نہیں لاتے) سو (جب یہ بات ہے تو) کیا آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں جس میں وہ ایمان ہی لے آئیں حالانکہ کسی شخص کا ایمان لانا بدون خدا کے حکم (یعنی مشیت) کے ممکن نہیں اور اللہ تعالیٰ بے عقل لوگوں پر (کفر کی) گندگی واقع کر دیتا ہے۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ
تو کہہ دیکھو تو کیا کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور کچھ کام نہیں آتیں نشانیاں اور
النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۱ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ
ڈرانے والے ان لوگوں کو جو نہیں مانتے ، سو اب کچھ نہیں جس کا انتظار کریں مگر انہی کے سے دن
الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ
جو گزر چکے ہیں ان سے پہلے ، تو کہہ اب راہ دیکھو میں بھی تمہارے ساتھ
الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝۱۰۲ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا
راہ دیکھتا ہوں ، پھر ہم بچا لیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان کو جو ایمان لائے اسی طرح ذمہ ہے
عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰۳
ہمارا بچا لیں گے ایمان والوں کو۔

خلاصۂ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ تم غور کرو (اور دیکھو) کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمان میں اور زمین میں، (آسمانوں میں ستارے وغیرہ اور زمین میں بے انتہا مخلوق نظر آتی ہے یعنی ان میں غور کرنے سے توحید کی دلیل عقلی حاصل ہوگی، یہ بیان ہوا ان کے مکلف ہونے کا) اور جو لوگ (عناداً) ایمان نہیں لاتے ان کو دلائل اور دھمکیاں کچھ فائدہ نہیں پہنچاتے (یہ بیان ہوا ان کے عناد کا) سو (ان کی اس حالت عناد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) وہ لوگ (بدلالت حال) صرف ان لوگوں کے سے واقعات کا انتظار کر رہے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں (یعنی باوجود دلائل

اور وعیدوں کے جو ایمان نہیں لاتے تو ان کی حالت اس شخص کے مشابہ ہے جو ایسے عذاب کا منتظر ہو جو کہ پہلی قوموں پر آیا تھا سو) آپ فرما دیجئے کہ اچھا تو تم (اس کے) انتظار میں رہو میں بھی تمہارے ساتھ (اس کے) انتظار کرنے والوں میں ہوں (جن گزشتہ قوموں کا اوپر ذکر تھا ہم ان پر تو عذاب واقع کرتے تھے) پھر ہم (اس عذاب سے) اپنے پیغمبروں کو اور ایمان والوں کو بچا لیتے تھے (جس طرح ان مؤمنین کو ہم نے نجات دی تھی)، ہم اسی طرح سب ایمان والوں کو نجات دیا کرتے ہیں یہ (حسب وعدہ) ہمارے ذمہ ہے (پس اسی طرح اگر ان کفار پر کوئی افتاد پڑی تو مسلمان اس سے محفوظ رہیں گے خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں)۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ
کہہ دے اے لوگو! اگر تم شک میں ہو میرے دین سے تو میں عبادت نہیں کرتا جن کی
تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۠ وَ
تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا اور لیکن میں عبادت کرتا ہوں اللہ کی جو کھینچ لیتا ہے تم کو
اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰۴ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ
اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں ایمان والوں میں ، اور یہ کہ سیدھا کر منہ اپنا
لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۰۵ وَلَا تَدْعُ مِنْ
دین پر حنیف ہو کر اور مت ہو شرک والوں میں ، اور مت پکار اللہ
دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا
کے سوا ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا اور نہ برا پھر اگر تو ایسا کرے تو تو بھی اسوقت
مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۰۶ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ
ہو ظالموں میں ، اور اگر پہنچا دیوے تجھ کو اللہ کچھ تکلیف تو کوئی نہیں اس کو ہٹانیوالا
اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَاۗدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ
اس کے سوا ، اور اگر پہنچانا چاہے تجھ کو کچھ بھلائی تو کوئی پھیرنے والا نہیں اس کے فضل کو ، پہنچائے اپنا فضل
يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۱۰۷
جس پر چاہے اپنے بندوں میں ، اور وہی ہے بخشنے والا مہربان۔

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ اے لوگو! اگر تم میرے دین کی طرف سے شک (اور تردد)

میں ہو تو (میں تم کو اس کی حقیقت بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ) میں ان معبودوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، لیکن ہاں اس معبود کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری جان قبض کرتا ہے اور مجھ کو (منجانب اللہ) یہ حکم ہوا ہے کہ میں (ایسے معبود پر) ایمان لانیوالوں میں سے ہوں اور (مجھ کو یہ حکم ہوا ہے) کہ اپنے آپ کو اس دین (مذکور توحید خالص) کی طرف اس طرح متوجہ رکھنا کہ اور سب طریقوں سے علیحدہ ہو جاؤ، اور کبھی مشرک مت بننا اور یہ حکم ہوا ہے کہ خدا کی (توحید) کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت مت کرنا جو تجھ کو نہ (عبادت کرنے کی حالت میں) کوئی نفع پہنچا سکے اور نہ (ترکِ عبادت کی حالت میں) کوئی ضرر پہنچا سکے پھر اگر (بالفرض) ایسا کیا (یعنی غیر اللہ کی عبادت کی) تو اس حالت میں (اللہ کا) حق ضائع کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے اور (مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ) اگر تم کو اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچا دے تو بجز اس کے اور کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں (بلکہ) وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں مبذول فرمائیں اور وہ بڑی مغفرت بڑی رحمت والے ہیں (اور فضل کے تمام افراد مغفرت اور رحمت میں داخل ہیں اور وہ مغفرت اور رحمت عظیمہ کے ساتھ موصوف ہیں پس لامحالہ صاحبِ فضل بھی ہیں)۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى

کہہ دے اے لوگو! پہنچ چکا حق تم کو تمہارے رب سے، اب جو کوئی راہ پر آئے

فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَمَآ اَنَا

سو وہ راہ پاتا ہے اپنے بھلے کو، اور جو کوئی بہکا پھرے سو بہکا پھرے گا اپنے بُرے کو، اور میں

عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ

تم پر نہیں ہوں مختار، اور تو چل اسی پر جو حکم پہنچے تیری طرف اور صبر کر جب تک فیصلہ کرے اللہ

وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝

اور وہ ہے سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا۔

خلاصۂ تفسیر

آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ اے لوگو! تمہارے پاس (دینِ) حق تمہارے رب کی طرف سے (بدلیل) پہنچ چکا ہے سو (اس کے پہنچ جانے کے بعد) جو شخص راہِ راست پر آجاوے گا سو وہ اپنے (نفع کے) واسطے راہِ راست پر آوے گا، اور جو شخص (اب بھی) بے راہ رہے گا تو اس کا بے راہ ہونا (یعنی اس کا وبال بھی) اُسی پر پڑے گا اور میں تم پر (کچھ بطور ذمہ داری

کے) مسلط نہیں کیا گیا (کہ تمہاری بے راہی کی باز پرس مجھ سے ہونے لگے تو میرا کیا نقصان ہے) اور آپ اس کا اتباع کرتے رہئے جو کچھ آپ کے پاس وحی بھیجی جاتی ہے (اس میں سب اعمال کے ساتھ تبلیغ بھی آگئی) اور (ان کے کفر و ایذاء پر) صبر کیجئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ (ان کا) فیصلہ کر دیں گے (خواہ دنیا میں ہلاکت کے ساتھ خواہ آخرت میں عذاب کے ساتھ مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے ذاتی اور منصبی کام میں لگے رہئے، ان کی فکر نہ کیجئے) اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔